چار دیواری

مریم جہانگیر

میں بہت چھوٹا تھا جب ایک دن دروازہ بجا. یوں لگتا تھا دروازہ بجایا نہیں جا رہا بلکہ موسلادھار بارش سے پہلے بادل گرج رہے ہیں. میں نے مٹی کے کھلونے وہیں چھوڑے اور اپنی چھوٹی سی نیکر سنبھالے دروازے کی ٹوٹی سی کنڈی پر پورا زور لگایا. چر چر چر کی مسلسل آواز کے بعد دروازہ کنڈی کے رکاوٹ سے آزاد ہوا اور چرمرا کر کھل گیا. وہ شخص دھاڑتا ہوا داخل ہوا. مجھے لگا میرے مٹی کے کھلونے بھی اس کے مقروض ہیں. اپنا سامان اٹھاؤ اور نکلو یہاں سے. میری ماں کے چہرے پہ یکلخت جھریاں نمودار ہوئی اور ہر جھری پہ بے بسی کی الگ داستان رقم تھی. اس نے بستر پہ پڑے میرے باپ کی طرف آس بھری نگاہوں سے دیکھا. میرا باپ جو گلے میں اٹک جانے والے بلغم کو نہ نگل سکتا تھا اور نہ کھل کر کھنکھار سے باہر نکل سکتا تھا. اس بے چارے کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا اور چہرے کی زردیوں میں گھل گیا. "اپنا ٹوپی ڈرامہ کسی اور کے سامنے جا کر کرو. مجھے تم لوگوں کو پالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے. مفت خورے, گھٹیا, جاؤ نکلو باہر. اتنے لوگ جھگیاں لگا کر بیٹھے ہیں تم لوگ کیوں نہیں لگاتے؟ بڑا گھر میں بسنے کا شوق ہے؟ اپنی اوقات نہیں دیکھتے. مجھے کرائے کا چوتھا حصہ تھما کر یہ نہ کہنا کہ کچھ دن اور رہنے دوں. مجھے اپنا مکان خالی چاہیئے"

وہ شخص آندھی طوفان کی طرح آیا اور چلا گیا. پیچھے کواڑ بجتے رہے. میں نے بہت چاہا کہ میں پھر سے اپنے مٹی کے گھوڑے کو چلاؤں لیکن فضا میں ایسی باس رچی تھی کہ میں چاہ کر بھی کھیل نہیں سکا. شاید یہ موت کا پیشگی رقص تھا جس نے مجھے اور ماں کو جامد کر دیا تھا. فالج زدہ باپ تو پہلے ہی کچھ کہنے کے قابل نہ تھا.

اس نے موت کے رتھ پہ ہاتھ رکھے اور صبح کے طلوع ہوتے سورج کی شفق پھیلنے سے پہلے ہمیشہ کی نیند سو گیا. ماں کو گونہ گو چین آیا. یہ چین نجانے کس کی وجہ سے آیا تھا شاید دوائیوں کے خرچے سے بچاؤ کی خوشی تھی یا پھر کسی پتھر دل پر اثر ہو جانے کی امید تھی. جنازہ واقعی سکون سے اٹھ گیا. میرے سر پہ اس دن اتنے لوگوں اتنی مرتبہ نے ہاتھ پھیرا کہ شاید فرشتے ان کی نیکیاں لکھتے تھک گئے ہونگے. بس ایک ہاتھ کھردرا تھا اس سے تب آشنائی ہوئی جب سوئم کے روز وہ شخص دوبارہ آیا اور اپنا مکان خالی کروالیا. چارو ناچار ماں اور میں اس گھر آئے جہاں وہ کھردرا

لمس تھا اور اسے میرے ماموں کا گھر کہہ کر پکارا گیا. مجھے بڑی جلدی احساس ہو گیا کہ ماں اس گھر کو اتنی تذلیل کے بعد بھی کیوں نہیں چھوڑ رہی تھی

اب کوئی راستہ نہیں تھا وہ ڈھیٹ بن گئی اور میں مفرور. وہ سارا دن جتی رہتی اور کوڑے دان کی طرح اپنے اندر سب بچے ہوئے کھانے اور گلی سڑی ہوئی باتیں ڈالتی رہتی. میں نے اپنا فرار کتابوں میں ڈھونڈ لیا. میں قلم کتاب کی نگری میں گم ہو کر رہ گیا. کاغذ کی خوشبو سونگھتا اور اپنے ارد گرد کی بو کو محسوس کرنا چھوڑ دیا. جب تک کتابوں میں رہتا خوش رہتا آنکھیں بند کئے بڑے بڑے اسباق ہضم کرنے کی کوشش کرتا. جو نہی پل دو پل کو زندگی پہ نظر ڈالتا ایسے ایسے سبق ملتے کہ بھلائے نہ بھولتے.

ماں آخر انسان تھی جس دن اس کا اندر اس سڑاند سے بھر گیا وہ خون تھوکتی مر گئی. میں بدلہ لینے کی اوقات میں تھا ہی نہیں. ماں کی تدفین کے بعد مجھے ہر وہ کہانی یاد آئی جس کا لب لباب یہ ہوتا کہ بھٹکتے بھٹکتے منزل مل ہی جاتی ہے. میں نے اس نتیجے کو اپنے ازار بند کے ساتھ باندھا اور گاؤں سے نکل آیا. کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا. اب میں تھا اور میری پڑھائی. جہاں تلوے چاٹنے پڑتے, چاٹ لیتا لیکن حرف دو حرف سیکھ لیتا. مجھے لگا تھا تعلیم میں نجات ہے. لوگوں کے سامنے تعلیم حاصل کرتے ہوئے بہت سے مقاصد ہوتے ہیں اتنے اونچے میناروں والے کہ جن کے نقش سے میں کبھی فنکاری نہ سمجھ سکا. میرے سامنے تعلیم کا واحد مقصد تھا پیسے کا حصول. زندگی فاقہ زدہ راتوں میں رینگتی رہی اور میں شفاف پانی کی پیاس لئے ایڑیاں رگڑتا رہا. یہ میں تھا جو میرے اندر تھا. یہ میں تھا جو میرے باہر تھا. اور یہ پیسہ تھا جو مجھے اندر اور باہر سے کھینچ رہا تھا

میں پیسے کی کشش میں زندگی کی چکی میں پستا رہا. چودہ جماعتیں پاس کی تو ماں کو یاد کرکے خوب رویا. کچھ دیر کو باپ کی یاد بھی ستائی لیکن ماں کو میں نے جاگتی آنکھوں سے منہ بھر بھر کر مرتے دیکھا تھا اس کا غم میرے اندر ہمیشہ پکتا رہا. جب ماں کو یاد کرکے رویا تو لاوے پہ کچھ پھوار پڑی. اب مجھے لگا تھا زندگی سہل ہو جائے گی. میں دھیرے دھیرے کامیابیوں کے زینے طے کرتا ہی چلا جاؤں گا لیکن وقت نے ثابت کیا کہ میں بلی ہوں اور میرے خواب میں بہت عمدہ نسل کے چھیچھڑے ہیں جن تک میری رسائی ممکن ہی نہیں. میں زندگی کو آسانی سے بسر کرنے کا خواب کانٹوں کے بستر کی طرح ساتھ لئے گھومتا رہا. بے چین رہا. پاؤں پٹختا رہا. سر مارتا رہا. لیکن نوکری نام کی چیز میری قسمت میں نہ تھی سو نہ ملی. مجھے مقدر پہ یقین اس دن آیا جب مجھے اپنا بوجھ اٹھانے کو وزن ڈھونا

پڑا۔ میں سجدے میں گرااور اس رب سے بہت فریاد کی جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے شاید اسی بات کی دیر تھی۔ ہلکا سا روزن کھلا۔ ایک کلرک کی نوکری مل گئی میں نے شکر کے کلمے پڑھے اور پیسوں میں سے ایک چوتھائی بچانے لگ گیا۔ نوکری تک پہنچتے پہنچتے میں عمر کا ستائیسواں ہندسہ عبور کر چکا تھا۔ اب زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آگیا لیکن یہ کیسا ٹھہراؤ تھا جو مجھے بے چین رکھتا تھا۔ گاہے بگاہے مجھے متوجہ کرتا تھا۔

میرے دفتر میں کام کرنے والے ساتھی مجھے شادی کا مشورہ دینے لگے۔ کچھ کو طور اطوار ایسے بھائے کہ رشتے تک تجویز کرنے لگے۔ میں نے ایک بھلے مانس کو مثبت عندیہ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک شرط بھی رکھی کہ میں ایک دھیلا خرچ نہ کروں گا۔ صرف قریبی ملنے جلنے والوں کو کھانا کھلا کر ولیمے کا ثواب بٹوروں گا

لڑکی والوں کی نجانے کیا مجبوری تھی۔ انہوں نے میری خواہش کا احترام کیا اور وہ میرے گھر آ گئی۔ وہ بے چاری بھی بھلئے لوک تھی۔ دوسرے لفظوں میں اسے اللہ لوک بھی کہا جا سکتا ہے وہ میری زندگی میں ایسے شامل ہوئی کہ اس کے آنے سے آنے کا بھی فرق نہیں پڑا۔ دیتا تو کھا لیتی نہ دیتا تو شکوہ نہ کرتی اس کے بھولپن کے باعث اسے مانگنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ میں اس کی شدید ضروریات بغیر مانگے پوری کر دیا کرتا۔ وہ اسے بھی احسان سمجھتی۔ بہت جلدی اللہ نے مجھے اولاد کی خوشخبری سے نوازا۔ یہ شاید دنیا کی واحد نعمت تھی جو اتنی جلدی مجھے مل گئی کہ میں بار بار رپورٹ دیکھتا کہ کیا یہ واقعی سچ ہے؟ نو ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ میری وہ سے کہیں زیادہ میں خود پریشان تھا۔ میں نے اپنی ایک چوتھائی پس پشت کی گئی تنخواہ سے ایک ٹکا نہیں نکالنا تھا۔ بچے کو اور ماں کو بھی محفوظ کرنا تھا۔

اس کے بھولپن اور میرے خواب پہ شاید قدرت کو بھی رحم آیا۔ وہ بغیر کسی پیچیدگی کے ماں بن گئی اور میں بغیر کسی اضافی خرچے کے باپ بن گیا۔ میں خوش تھا بہت خوش ..... ایک بیٹا اس کے بعد بیٹی اور پھر بیٹا ..... اللہ نے مجھے رحمت کے تحفے پہ نعمت لپیٹ کر دی۔ میں جتنا شکر ادا کرتا کم تھا۔ تنخواہ کچھوے کی چال سے بڑھ رہی تھی اور مہنگائی نے کسی خرگوش کی رفتار کو بھی مات دے رکھی تھی۔ میں نے اس سب میں بھی اپنی باقاعدگی کو کسی اختلاف سے دوچار نہ ہونے دیا۔ میں ایک چوتھائی تنخواہ اسی طرح ایک طرف کرتا رہا۔ اس راز سے کبھی بیوی کو بھی واقفیت نہ ہونے دی۔ وہ دانتوں سے پکڑ پکڑ کر پیسے خرچ کرتی۔ مہینے کے پندرہ دن بعد ہی اس کی اپنی خوراک کم ہو جاتی۔ وہ ماں تھی بچوں کو چاہ کے بھی نہ روک پاتی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں پیاس دیکھی لیکن میں اسے بجھا نہیں سکتا تھا. عید کے عید سب کے لئے ایک جیسا کپڑا لے آتا ایک ہی رنگ کا..... جسے وہ پانچ مختلف سائز میں کاٹ کر سب کے لئے تیار کر لیتی. عید پہ ہم سب فوج لگتے ایک جیسے کپڑے اور ایک جیسی بے چارگی لئے شکلیں. بچے مجھ سے فاصلے پہ رہتے. انہوں نے کبھی مجھ سے کوئی خواہش نہیں کی کیونکہ انہیں لگتا تھا میں کوئی خواہش پوری ہی نہیں کر سکتا. وہ ٹاٹ پہ بیٹھ کر پڑھتے رہے. مجھے مقدر نصیب کے کھیلوں پہ یقین تھا. ان کی تعلیم پہ زیادہ پیسہ نہ لگایا کیونکہ اچھی تعلیم اچھی تنخواہ کی ضامن نہیں ہوتی. دن رات کی شال اوڑھے صفحاتِ زیست کو پلٹتے رہے. میں تکتا رہا. پہلے میں سیدھا چلتا تھا پھر کمر کچھ دہری ہو گئی. پٹھے کھنچ گئے. گھٹنوں پہ ورم آنے لگا. میرے ہاتھ کچھ تھامتے تو کپکپا جاتے. میرے لفظ لبوں پہ تھر تھرا جاتے. میں خود کو لاکھ اپنے کام دھندے یاد کرواتا لیکن بھول جاتا. اگر نہ بھولتا تو بس خواب دیکھنا, مسلسل دیکھنا ...... اب کچھ حاصل ہونے کی آس لگی تھی. میں نے آس کو کوششوں سے پروان چڑھایا. اور خواب پہ اپنی بوڑھی آنکھیں گاڑ کر بیٹھ گیا. یہ میری جاگیر تھا میں کیسے کسی کو اس میں حصہ دار بناتا.

میں اکیلا ٹوٹتا رہا. تھکاوٹ سے میرا پور پور زخمی ہونے لگ گیا. میں پھر بھی جتا رہا. مجھے کر دکھانا تھا. مجھے اپنے بچوں کی ان کہی خواہشوں کا بدل ان کے سامنے پیش کرنا تھا. میں اپنی ہڈیاں توڑتا رہا. میرا جوڑ جوڑ جواب دے گیا. میں ریٹائر ہو گیا. سالوں کی عرق ریزی کا نتیجہ تھا کہ میرا خواب حقیقت بن کر میری آنکھوں کے سامنے تھا. دو آنکھوں سے کائنات کیسے دیکھی جا سکتی ہے میں نے جان لیا.

میں مکان میں آیا. خواب تک پہنچنے کے لئے کرایہ بھی نہیں تھا. میں نے بیوی بچوں کو لیا اور پیدل نکل پڑا. وہ بے دام کے غلام تھے چل پڑے. گھر والے بے دام غلام ہی تو ہوتے ہیں. سو غلطیاں کرو ساتھ نبھاتے ہیں. جہاں مرضی سے لوٹ کر آؤ لے سے لگاتے ہیں. سارا زمانہ خلاف ہو جائے ساتھی بن جاتے ہیں. یہ اور بات کہ اگر ان سے ٹانگ پڑے تو بندہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا.

وہ چپ چاپ میرے پیچھے چلتے رہے. لڑکے بھی خدا کا شکر فرمانبردار تھے. پیچھے ہی چلے کبھی قدم کاٹنے کی کوشش نہ کی. میں ان کا رہنما تھا لیکن تھک چکا تھا اور ان کے قدموں کی تیزی مجھے تیز ہونے پہ مجبور کر رہی تھی. میرے جسم سے پسینہ چھوٹنے لگا جیسے متاعِ قیمتی ہاتھ سے نکلتی ہے. لیکن بہت پرانی کشش کا سمندر مجھ میں ٹھاٹھیں مارنے لگا اور میں اپنے پسینے کو روندتا چلتا گیا.

جونہی خواب نظر آیا. میری نظر دھندلا گئی. میں نے ہاتھ میں تھامی چابی کو زور سے بھینچا لیکن سہارا کافی نہ تھا. میں گر گیا. میرا چہرہ پسینے سے تر بتر تھا. دہلیز دسترس میں تھی. بیٹوں نے کندھے پہ اٹھایا اور بیوی نے چابی کی روشنی میں گھر کے برآمدے میں پہنچا دیا. میں ہوش میں بھی تھا اور بے ہوش بھی تھا. میں کچھ کہنے سے قاصر تھی. میری بند آنکھوں سے بیوی کی پریشانی ہویدا تھی. بیٹی آنچل سے ہوا دینے کی کوشش کر رہی تھی. میں آنکھیں کھولنا چاہتا تھا لیکن کھول نہیں پایا. میرے ٹھنڈے جسم سے چاروں کو خوف آیا. بیٹے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے پر تول رہے تھی. بیوی بھولپن سے بولی "صاحب جی کو میرے منہ میں خاک کچھ ہو تو نہیں گیا؟" میں مسکرا پڑا اور ساری ہمتیں جمع کر کے بولا. "تمہیں کیا لگتا ہے میں اس چار دیواری میں تمہارے ساتھ سانس لئے بغیر مر سکتا تھا؟"